میؔر۔۔۔اپنے عہد میں

ڈاکٹر عابدہ بتول

Dr. Abida Batool

Associate Professor, Department of Urdu,

F.C. College, Lahore.

Abstract:

Era of Mir, is a time of unrest and anxiety. Mir saw that nothing in the world was stable. He accepted the effects of the circumstances of his time to such an extent that he changed the mood of ghazal. He coined new symbols in the face of events and catastrophes of his time. Mir expressed the grief of the decline of his era in the form of his own style which has made his poetry everlasting. This article gives a brief overview on Mir and his era.

میر تقی میؔر کا دور برصغیر میں سکون اور اطمینان سے محروم دور تھا۔ میؔر (پیدائش ۱۷۲۲ء) کے ہوش سنبھالنے تک مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر (متوفی ۱۷۰۷ء) کی وفات کو ربع صدی گزر چکی تھی۔ موصوف کی ساری عمر دکن میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے نبرد آزمائی میں گزر چکی تھی نتیجتاً اس کے آنکھیں موندتے ہی مغل سلطنت سرعت سے روبہ زوال ہونے لگی۔ میر تقی میؔر نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں اس طوائف الملو کی اور سیاسی افراتفری کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔

میؔر نے دیکھا کہ دنیا میں کسی بھی شے کو ثبات نہیں ہے، نہ تو پھول قائم ہیں نہ کلی اور جو لوگ ایک دن حکمران ہیں کل کو ان کا کاسہ سر مشروب کے ظرف کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسی کیفیت میں بھلا زندگی کی مثبت اقدار میں ایمان کیسے جما رہ سکتا ہے؟

میؔر غزل کے بادشاہ ہیں انھوں نے اپنے زمانے کے حالات سے اس حد تک اثرات قبول کیے ہیں کہ غزل کا مزاج اور انداز تک بدل دیا۔ اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور عصری تباہی اور بربادی کو سامنے رکھ کر انھوں نے نئے رموز و علائم اور نئے اشارے کنائے وضع کیے۔ مثلاً:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
(کلیات میر، صفحہ ۳۷)

دل کی ویرانی کو نگر کے لٹنے سے تعبیر کرنا حالات کے براہِ راست تاثر کا نتیجہ ہے یہی وہ ایمائیت ہے جو غزل کی اصل روح ہے۔ ایک بڑے اور گہرے تاثر کو چند لفظوں میں بیان کر دینا ہی غزل کی خوبی ہے۔

''یہ مسلم ہے کہ غزل میں جس چیز کو تغزل کی جان کہتے ہیں وہ اس کی رمزی اور ایمائی کیفیت

سے مشروط ہے۔ رمزی اور ایمائی کیفیت غزل میں تبھی پیدا ہوتی ہے جب غزل گو نہ صرف الفاظ کے صحیح معانی اور ان کے تمام دلالت ہائے امتزاجی سے واقف ہو بلکہ اس نکتے سے بھی آگاہ ہو کہ صنائع و بدائع لفظی و معنوی کی غائیت کیا ہے؟''(۱)

میرؔ کی پیدائش کا سال ۱۷۲۲ء اور وفات کا سال ۱۸۱۰ء ہے۔ اپنی نوے سالہ زندگی کے دوران میں وہ انھی ناکامیوں اور محرومیوں سے وابستہ رہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے جملہ سیاسی و سماجی حالات و واقعات کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ کئی لڑائیوں اور جنگوں میں وہ امراء کے ہم رقاب رہے۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی نے ان کے سامنے دہلی پر یلغاریں کیں۔ سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور مرہٹوں نے جو قتل عام کیا، اہل ہند کو لوٹا گیا اور تہ وتیغ کیا گیا، وہ دہلی کی تباہی اور بربادی کے ناظر تھے۔ میرؔ سمجھتے تھے کہ دِلی نہیں لٹی ان کا دل لٹا ہے۔ وہ اس شہر کا ماتم کرتے ہیں جو عالم میں انتخاب تھا اور جس کی گلیاں تصویر کی مانند تھیں۔ احباب کے دم سے رونقیں تھیں۔ ہر قدم پر یہاں اک گھر تھا۔ ہنرمند اہل حرفہ اور تلامیذ الرحمان یہاں پر جمع تھے۔ یہ شہر دنیا کی بڑی تہذیبوں میں ایک تہذیب کا حامل تھا۔ چہار دانگ عالم سے لوگ یہاں اس باغ و راغ اور گل و گلستان کی سرزمین پر آتے تھے۔ دِلی کے گلی کوچے ان خیالی تصویروں کی طرح تھے جن کی صورتیں اور کردار ہمارے عمومی ادب کا حصہ اور ہمارے افسانوی ادب کا سرمایہ ہیں۔ اسی لیے میرؔ بے خودی اور سرمستی میں کہہ اٹھتے تھے:

دِلی کے نہ کوچے تھے اوراق مصور تھے
جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی

عالم آئینہ جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

میرؔ نے پورے عہد کو زوال آمادہ ہوتے دیکھا اور اس کے تنزل و انحطاط کو اپنی روح کا کرب بنا لیا۔ ایک بڑا ادیب اور شاعر غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں بدل لیتا ہے۔ ایک تخلیقی اور عظیم شاعر کا یہی طرہ امتیاز ہے کہ زمانے کے سرد و گرم کو اپنی ذات کا حصہ بنالیتا ہے اور پھر اسے اپنے فن کی صورت میں ظاہر کر دیتا ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

''میرؔ کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ یاس پرست تھے اور ان کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی ہے۔ وہ زندگی اور عشق دونوں کے حوصلے ہم سے چھین لیتے ہیں۔ مجھے اس رائے سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ میرؔ اپنے دور کی بدحالی اور اپنے نجی سانحاتِ زندگی سے بغاوت کی حد تک ناآسودہ تھے اور ان کے بیشتر اشعار پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو ان کے لہجے میں بغاوت کا ایک مہذب اور پُرتمکنت احساس ملے گا۔ ہر دور میں بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے زمانہ کی کشاکشوں کا خودداری اور وقار کے ساتھ رچے ہوئے اشاروں میں اظہار کرے لیکن شعر کو پروپیگنڈہ نہ ہونے دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاعر کی عظمت کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے اندر بغیر واعظانہ یا مبلغانہ ڈھن اختیار کیے ہوئے یہ احساس پیدا کر سکے کہ ان کو بھی اپنے زمانے کی نئی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا خوداعتمادی کے

ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔''(۲)

ہرتخلیق کار اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کی ذات اور اس کے گردوپیش میں ہونے والے واقعات، سانحات اور حوادث اس کی تخلیق کا لازمہ ہوتے ہیں۔ یوں اس کے تخلیقی رجحانات ماحول کے تابع ہوتے ہیں۔ میؔر کی شاعری کو استثناء حاصل نہیں ہے ان کے ہاں بھی ماحولی اور معاشرتی تبدیلیاں شعور کی رو کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، میؔر کی منظر کشی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''میؔر کی شاعری میں قدرتی منظران کے جذبے کا حصہ بن کر آتے ہیں۔ ایک ایسی تصویر جو آئینے کی طرح صاف تو ہے لیکن جسے مصور اپنے موقلم سے صفحہ قرطاس پر بنانا چاہے تو منہ سے خون تھوکنے لگے۔ میؔر اپنے تخلیقی عمل سے آنکھوں کے سامنے لفظوں سے ایسی صاف تصویر رکھتے ہیں جسے رنگوں سے ابھارنا ممکن نہیں ہے۔ اس میں میؔر کے مخصوص طرز و آہنگ کی وہ جھنکار موجود ہے جو میؔر کے ہر رنگ کو ایک نیا، اچھوتا رنگ بنا دیتی ہے۔ یہ تصویریں بظاہر خارجی رنگ لیے ہوئے ہیں لیکن یہ میؔر کے باطن سے خارج میں آئی ہیں۔''(۳)

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہالِ سبز جھومیں ہیں گلستاں میں شرابی سے(۴)

صد رنگ بہاراں میں اب کی جو کھلے ہیں گُل
یہ لطف نہ ہو ایسی رنگینی ہوا کی ہے(۵)

میر تقی میؔر کو دردوغم کا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے غم زدہ ہونے کا اظہار میؔر نے خود کیا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میؔر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا(۶)

اس سے پہلے کہ ہم میؔر کے تصورِغم کا تجزیہ کریں مناسب معلوم ہوتا ہے، پہلے ان عوامل کو تلاش کریں جو ان کی شاعری پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ ان کا کلام سراپا درد بن گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، میؔر کی دردمندی کے سرچشموں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر کی دردمندی کے سرچشمے ان کے خاندانی ماحول سے پھوٹتے ہیں۔ چچا کا غنچہ اور والد کی مجذوبانہ سیرت، ان کا صوفیانہ طرزِ زندگی اور صبح وشام کی بے حد خودی اور استغراق، یہ موروثی تاثرات ہیں۔ بے وقت یتیمی، اعزہ کی بے مہری، زمانے کی جفا کاری، بے روزگاری، فاقہ کشی، دربدری، خاد بسری اور دوسرے مصائب و آلام نے میؔر کے ذہن کو تقریباً باولا کر دیا تھا۔ زمانے نے میؔر کو قدم قدم پر ناقص ہونے، بے کس ہونے، غیر مکمل ہونے کا احساس دلایا۔ ان کی فطرت تکمیل چاہتی تھی مگر ایک غنچہ ناشگفتہ کی طرح یہ کلی بند کی بند رہی۔ ان کی مثالی دنیا ان کے ذہن وخیال ہی میں رہی۔ خارج میں وجود نہ پا سکی۔ یہ عدمِ تکمیل کا احساس

میؔر کی لفظی تصویروں اور تشبیہوں اور استعاروں میں بھی موجود ہے اور ان کی لفظیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اتفاق کی بات ہے کہ زمانے کے اجتماعی احساسات اور عبرت انگیز واقعات بھی میؔر کے رجحان اور نقطۂ نظر کے موید ہوئے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے، قتل عام، مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی دست برد اور لوٹ مار، شہروں اور آبادیوں کی بربادی، معاشی اور اخلاقی معیاروں کی بے قدری، یہ سب امور میؔر کے ذاتی غم کے گویا خارجی اور اجتماعی معاون تھے۔''(۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی، میر تقی میؔر کی شاعری میں پائے جانے والے ''غم'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میؔر کو غم و الم کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ غم و الم اس دور میں بھی تھا اور خود میؔر کے مزاج میں بھی، جو اس دور کی طرح کے ترجمان تھے......لیکن غم ان کے ہاں انسانی زندگی کا ایک حصہ بن کر آیا ہے۔ اس میں ان کی ذاتی ناکامیابی بھی شامل ہے اور زمانے کا وہ انتشار اور وہ بربادی بھی جس کے میؔر عینی شاہد تھے۔ لیکن میؔر کی شاعری میں غم کی نوعیت ڈھانے اور چلانے والی نہیں ہے۔''(۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ میؔر کی جوانی کی شاعری جوش و ہنگامہ سے بھرپور ہے، اس لیے اس دور کی شاعری پر افسردگی یا درد و غم کا پرتو نہیں ہے البتہ ان کی آخری عمر کی شاعری پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''میؔر کی زندگی میں خارجی لحاظ سے گرم جوشی بہت کم نظر آتی ہے اور اگر ہے تو اس کا مظاہرہ بدمزاجی اور آشفتگی کی صورت میں ہے، مگر میؔر اپنے آپ کو افسردہ دل نہیں مانتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میؔر گو کہ خارج میں سرد اور کم جوش نظر آتے ہیں، مگر ان کے ذہن کی دھنیں جوش و خروش اور ہنگاموں سے لبریز رہتی ہیں......ان کی جوانی کی شاعری ان کی افسردگی کا اقرار نہیں کرتی، البتہ وہ اپنی عمر کے آخری دور میں اپنی افسردگی کا اکثر ذکر کرتے ہیں اور اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں جب وہ افسردہ نہ تھے۔''(۹)

یہ میر ستم کشتہ کس وقت جواں تھا
اندازِ سخن کا سبب شعور و فغاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دِلی سے نکلتا
ساتھ اس کے یامت کا سا ہنگامہ رواں تھا(۱۰)

میؔر اپنے ماضی کو یاد کر کے اپنی افسردگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں ، نہ وے زمانے ہیں(۱۱)

میؔر کے اشعار میں درد و غم کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے ''دردمندی'' کا لفظ متعدد بار استعمال ہوا ہے مثال کے طور

پر ان کے یہ دو اشعار سنیے!

نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد(۱۲)

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اپنی(۱۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ، میرؔ کے غم (دردمندی) کی نوعیت بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''میرؔ کا غم انفرادی تھا۔ اجتماعی نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اجتماعی احساسات بھی ان کے انفرادی احساس کے عین مطابق ہیں اور وہ اس لحاظ سے اپنے زمانے کی نمائندگی کر سکتے ہیں مگر میرؔ فطرتاً خود مشغول آدمی تھے۔ وہ کیفیت جسے ''بے خودی'' کہتے ہیں، وہ بھی درحقیقت خارجی ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات میں گم ہونے سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جہاں عام انسانیت کا ماتم کیا ہے، وہاں بھی دراصل اپنے ہی غم کی کہانی بیان کی ہے۔''(۱۴)

''میرؔ کے غم میں یاس کا رنگ تیز ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ میرؔ کے غم میں قدرے نشاطیہ کیفیت موجود ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے غم انگیز اشعار کو پڑھ کر طبیعت کند نہیں ہوتی۔ ان کا غم پرلطف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے غم میں شریک ہونے کو جی چاہتا ہے۔''(۱۵)

ملنے والو! پھر ملیے گا، ہے وہ عالم دیگر میں
میرؔ فقیر کو سکر ہے، یعنی مستی کا عالم ہے اب(۱۶)

اس امر کی کیا وجہ ہے کہ میر کا غم بہت ہم شکن نہیں۔ اس کا جواب ہمیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس تجزیہ سے ملتا ہے:

''میرؔ کے غم میں تلخی پائی جاتی ہے۔ پھر ان کا غم کیوں اہمیت شکن نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرؔ کی لفظی تصویروں میں ''ہل چل'' کا عنصر موجود ہے۔ ایک طرف سے ان کے غم میں خلوص اور راستی ہے دوسری طرف ان کی عام تصویروں میں ہنگامہ اور زندگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب ہل چل ان کے ذہن کے اندر ہے مگر قاری اور سامع کیٹر ژفضئ لیے جوش اور مسرت کا سامان پیدا کرتا ہے۔''(۱۷)

خواہ مارا انھیں نے میرؔ کو، خواہ آپ موا
جانے دو یارو! جو ہونا تھا ہوا، مت پوچھو!(۱۸)

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی، میر کا غم تزکیہ (کیتھارسس) کا ایک وسیلہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرؔ کے غم میں تلخی، بیزاری اور زہر بھری یاسیت کے بجائے صبر، تسلیم و رضا اور جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے۔ اتنے پہاڑ جیسے غموں کے باوجود میرؔ کی بڑی عمر کا راز یہ بھی ہے کہ انھوں

نے اپنی شاعری سے خود اپنے غموں کا تزکیہ (کیتھارسس) کیا ہے اور یہی تزکیاتی اثر میؔر کی شاعری پڑھنے والے پر ہوتا ہے۔''(۱۹)

میر کی غزلوں میں جو تصورِ عشق ابھرتا ہے اس کا تعلق عظمت انسانی سے بھی ہے۔ میؔر نے جس وقت آنکھیں کھولیں اس وقت پورا معاشرہ طبقوں اور ذاتوں میں بٹا ہوا تھا۔ کہیں مذہبی اختلافات کی بنا پر انسانیت پامال ہو رہی تھی تو کہیں خاندانی نجابت اور ذات کو ہتھیار بنا کر انسانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کی جا رہی تھی۔ سماج کی ان ناہمواریوں کا علاج عشق کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا میؔر نے بھی انسانی عظمت کے تحفظ کا نظریہ پیش کیا اور عشق کو ہی سب سے افضل اور مقدم مانتے ہوئے مذہب وملت اور رنگ ونسل کے امتیاز پر کڑی تنقید کی۔(۲۰)

اس سلسلے میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

میؔر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میؔر
مذہب عشق اختیار کیا

عشق میؔر کی شاعری کی روح ہے اسی سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس ایک موضوع نے انھیں عظیم شاعر بنا دیا ہے۔ میؔر کی شاعری کو ہم اس لیے بھی عشقیہ شاعری کہہ سکتے ہیں کہ اس میں مقامیت بھی ہے اور آفاقیت بھی۔ تاحال میؔر کا رنگ کسی اور شاعر میں نہ مل سکا۔ چند ایک نے ان کی پیروی کی کوشش کی مگر ناکامی ان کے ہاتھ لگی۔ میؔر کی شاعری کا مخزن ان کا عشق اور اس سے پیدا ہونے والا جنون ہے جو نوجوانی میں ان پر سوار ہوا اور جس کا ذکر مثنوی ''خواب وخیال'' میں انھوں نے خود کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنے شہر میں ایک پری بے مثال ان کی عزیز تھی وہ در پردہ اس سے عشق کیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ غم و یاس فکر و افسردگی نمایاں ہے لیکن عشق تو ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ غم روزگار سے وہ ہمیشہ دوچار رہے۔ غمِ جاناں نے بھی اس میں شامل ہو کر ان کی شاعری کو لافانی بنا دیا۔

حوالہ جات

۱۔ عابد، عابد علی، سید، مقالاتِ عابد انتقادِ شعر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۲۲
۲۔ مجنوں گورکھپوری، میؔر اور ہم، مشمولہ: نقوش، میؔر نمبر، شمارہ ۱۲۵، لاہور: فروغِ اردو، ۱۹۸۰ء، ص:۲۶۳
۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طبع سوم، ۱۹۹۴ء، ص:۵۹۳
۴۔ میر، میر تقی، کلیات میر، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، کراچی: اُردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص:۷۰۲
۵۔ ایضاً، ص:۵۰۵
۶۔ ایضاً، ص:۵۴۷
۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، نقدِ میؔر، دہلی: جہانگیر بک ڈپو، س ن، ص:۳۵
۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص:۵۸۴
۹۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، نقد میر، ص:۶۵۶

۱۰۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص:۳۸۰
۱۱۔ ایضاً، ص:۴۵۹
۱۲۔ ایضاً، ص:۵۷۷
۱۳۔ ایضاً، ص:۵۸۷
۱۴۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، نقد میؔر، ص:۸۵
۱۵۔ ایضاً، ص:۸۷
۱۶۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص:۵۸۷
۱۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، نقد میر، ص:۸۷
۱۸۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص:۲۶۱
۱۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص:۵۸۵
۲۰۔ ظفر، ظفر انصاری، تصورِ عشق اور میؔر کی شاعری، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص:۱۴۶

☆......☆......☆